باب پنجم

اقامت دین کا طریق کار

مقصد سے اصول کار کا فطری ربط

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ ہماری زندگی کا عملی نصب العین دین حق کی اقامت ہی ہے اور کوئی تاویل یا عذر اس کی ذمے داری سے ہمیں کبھی سبکدوش نہیں کر سکتا، تو اب پوری سنجیدگی اور اہمیت سے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نصب العین کے لیے جدوجہد کس طرح کی جائے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریق کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس منزل مقصود کی طرف مارچ کر سکتے ہیں؟ جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہو گا وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ ہر جماعت کا جو کسی مقصد کو لے کر اٹھی ہو، جس طرح ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص انداز فکر ہوتا ہے اسی طرح اس کی تشکیل، تنظیم اور تعمیر کا بھی ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ اس انداز فکر کی طرح اس انداز تعمیر کا تعین بھی وہی مقصد کرتا ہے جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہوتی ہے۔

اس اصولی حقیقت کو چند مثالوں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض کیجیے کہ آپ کو ایک قومی حکومت قائم کرنا ہے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو جو کچھ کرنا ہو گا وہ یہ ہو گا کہ آپ پہلے تو اپنے افراد قوم کے دلوں کو وطنی سربلندی اور قومی اقتدار کے عشق سے معمور کریں۔ ان میں اپنے اوپر آپ حکمران ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں، پھر قومی آن پر نثار ہو جانے کے لیے ان کے اندر سرفروشی کی آگ بھڑکائیں اور اپنے محبوب مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کی قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیں۔ جب یہ سب آپ کر لیں تو بس سمجھ لیجیے کہ کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کر لیں۔ اب آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ میرے جھنڈے کے نیچے

جو لوگ جمع ہیں وہ توحید کے متعلق، رسالت کے متعلق، قیامت اور جزائے عمل کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں؟ ان کے اندر دین کی پابندی کتنی ہے؟ انھوں نے سچائی، رحم دلی، پاک دامنی، خوش خلقی اور خدا ترسی جیسے اوصاف سے اپنے کو کہاں تک آراستہ کرلیا ہے؟ ان میں سے کسی چیز کے بھی دیکھنے کی آپ کو حاجت نہیں، کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے اس کے سامنے ہے اس کے لیے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں ہیں بلکہ شاید کچھ مضر ہی ہوں۔ یہاں تو جو چیزیں مطلوب ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ حریف طاقتوں سے اندھی دشمنی اور قوم سے اندھی محبت رکھیے اور اس دشمنی اور محبت میں سب کچھ کر گزریے۔

اسی طرح اگر آپ ملک میں کمیونزم کا اقتدار اور کمیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہن میں کمیونسٹ فلسفۂ زندگی، کمیونسٹ نظام معیشت و حکومت اور کمیونسٹ نظریۂ اخلاق کی ''خوبیاں'' اتارنی ہوں گی۔ سرمایہ پرستی ہی نہیں بلکہ سرمایہ داری کے بھی خلاف دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنی ہوگی۔ مارکس اور لینن کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہوگی جو خدا اور پیغمبر کے لیے اہل مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور خدا، رسول، آخرت، دین، اخلاق اور اعمال صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کر اور ان کے اثر کو ذہنوں سے مٹا کر خالص مادی تصور حیات اور حیوانی تصور کائنات ان پر ثبت کرنا ہوگا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد جمالیں اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو ان خیالات اور نظریات کا گرویدہ بنالیں تو ان کا ایک جتھہ بنا کر ایک طرف باقی عوام کو اپنے پروپیگنڈے کے زور سے مسحور کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں اور دوسری طرف خفیہ اور علانیہ تمام ممکن ذرائع سے موجودہ نظام حکومت کے تخت کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں۔ تاآنکہ عوام کے ہاتھوں یہ تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہوجائے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر ایک شخص منظم طریقے پر رہزنی کرنا چاہتا ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے گا جو مضبوط جسم، بے خوف دل اور خونخوار فطرت رکھتے ہوں۔ ایسے آدمی اس کے کسی کام کے نہ ہوں گے جو نرم دل ہوں اور غارت گری و خون ریزی سے متنفر ہوں۔

جب ایسے لوگوں کو وہ حاصل کرلے گا تو ان ''ضروری اور کارآمد'' صفتوں کا ان میں مزید استحکام پیدا کرنے کی تدبیریں کرے گا۔ لوٹ مار کے انھیں گر سکھائے گا۔ اسلحے مہیا کرے گا۔ تب کہیں جا کر اپنی مہم کا آغاز کرسکے گا۔

غرض دنیا کی ہر بامقصد جماعت کا یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیشِ نظر مقصد سے فطری لگاؤ رکھتے ہوں اور لازماً ایسے ہی طریق کار اور ایسی ہی پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ ''امت مسلمہ'' کہلانے والی جماعت اور قیام دین کا مقصد بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک خاص طریق کار ہونا چاہیے، آیئے دیکھیں وہ طریق کار کیا ہے؟

طریق کار کے ماخذ

اس غرض سے ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو قدرتاً وہ قرآن اور سنت ہی پر جاکر ٹھیرتی ہے کیونکہ جہاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقامتِ دین ہمارا فریضۂ حیات ہے۔ حق یہ ہے کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے اصول کار بھی وہیں سے ملیں۔ کیا قرآن اور سنت نے ہماری اس ضرورت کو محسوس کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہر حیثیت سے مکمل اثبات میں ہے۔ اسلام سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والا بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن اور صاحب قرآنؐ نے جس طرح امت مسلمہ کا مقصد وجود بالکل وضاحت سے بیان کر دیا ہے اسی طرح اس کے طریق کار کے بارے میں بھی انھوں نے کوئی حجاب باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ چنانچہ ہر اس آنکھ کو جو اندھی نہ ہو' قرآن اور سنت کے صفحوں میں یہ طریق کار اسی طرح نمایاں اور روشن دکھائی دے سکتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینے پر جگمگاتی کہکشاں' قرآن' قرآن کے طریق نزول اور صاحب قرآنؐ کے اُسوے' تینوں سے طریق کار کی کھلی کھلی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو کہنے میں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر زیر بحث مقصد کے اعتبار سے تینوں دراصل ایک ہی ہیں۔ قرآن کے نصوص کو چونکہ اس معاملے میں بنیاد کی حیثیت

حاصل ہے اور باقی دو چیزیں اس کے توابع اور لوازم کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لیے اقامتِ دین کے اصول وطریق کار کی بنیادی وضاحت بھی ہمیں اسی سے لینی چاہیے۔

اقامتِ دین کے قرآنی اصول

قرآن حکیم کو غور سے پڑھیے تو وہ اصول و نکات بڑی آسانی کے ساتھ ہاتھ آ جاتے ہیں جن کے مطابق اقامت دین کی جدوجہد کی جانی چاہیے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان اصولوں کی تفصیل سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو توقع کے عین مطابق ہے کیونکہ جب اس کے مباحث کا اصل مرکز ہی یہی اقامت دین ہے تو قدرتی طور پر اس کی ساری تفصیلات بلاواسطہ یا بالواسطہ اسی کے اصول و ذرائع کی شرح و تفصیل ہی ہوں گی۔ لیکن چونکہ قرآن اپنے مدعا کو انسانی ذہن میں پوری طرح بٹھا دینے اور اچھی طرح محفوظ کر دینے کے لیے کوئی ضروری تدابیر اٹھا نہیں رکھتا اور جہاں تک اقامت دین کے مسئلے کا تعلق ہے وہ تو اس کا سب سے اہم بنیادی مسئلہ تھا۔ اس لیے اس کے اصول و طریق کار کو اس نے جہاں سینکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیا ہے۔ اور مختلف جگہوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہاں بعض مقامات پر اس نے انھیں اکٹھے سمیٹ کر بھی بیان کیا ہے تاکہ چند جملوں کے مختصر سے آئینے میں ان کی پوری تصویر بیک نظر بھی دیکھی جا سکے۔ اس طرح کے ''جوامع الکلم'' میں سب سے زیادہ جامع اور ساتھ ہی سب سے زیادہ واضح آیتیں یہ ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ .... وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ آل عمران 3:105-102

اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو اور دنیا سے نہ رخصت ہو مگر اس حال میں کہ تم ''مسلم'' ہو اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دل باہم جوڑ دیے۔ اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے...... اور چاہیے کہ تم وہ گروہ بنو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکتا رہے' ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلاف میں مبتلا ہو گئے۔

یہ آیتیں مدینہ کی زندگی' یعنی ۳ھ میں نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ عین اس زمانے میں یہ آیات کریمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامت دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں جس میں اقامت دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصول ہی بتا دیے گئے ہیں بلکہ یہ بھی واضح فرما دیا گیا ہے کہ ان اصولوں میں باہم ترتیب کار کیا ہونی چاہیے؟ نیز یہ بات بھی کہ اس کے اس نصب العین کی خاطر کی جانے والی جدوجہد کن تدریجی مرحلوں سے گزرتی ہوئی اپنی غایت مقصود تک پہنچا کرتی ہے۔ اس ربانی پروگرام پر غور کیجیے تو وہ تین اجزا یا اصولی نکات پر مشتمل دکھائی دے گا۔

(۱) تقویٰ کا التزام (۲) مضبوط و منظم اجتماعیت (۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر: یہی تین نکات ہیں جو اقامت دین کے بنیادی اصول کار ہیں۔ ان کو تفصیل کی روشنی میں دیکھیے۔

(۱) تقویٰ کا التزام

اقامت دین کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے اور جس کو اس راہ کی ''شرط اول قدم'' کہنا چاہئے۔ وہ اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ O آل عمران 3:102 کے فرمان خداوندی میں مذکور ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے کو ''ایمان والا'' سمجھتا ہو' اور جو اس ایمان کی عائد کی ہوئی ذمے داری سے

عہدہ برآ ہونا چاہتا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ اللہ کا ''تقویٰ'' اختیار کرے اور اپنے آخری سانس تک ہر آن اور ہر لمحہ ایک ''مسلم'' بن کر زندگی بسر کرے۔ ''تقویٰ'' کا پورا عملی مفہوم جو قرآن کی زبان سے بیان ہوا ہے اس سے شمہ برابر بھی کم نہیں کہ اللہ کے تمام حکموں کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے۔ اس کے کسی امر کو چھوڑ دینے سے بھی ڈرا جائے اور اس کی کسی نہی کے کر گزرنے سے بھی خوف کھایا جائے۔ اسی طرح ''مسلم'' کے معنی بھی قرآنی بیانات کی روشنی میں سچے فرماں بردار اور مخلص اطاعت شعار کے ہیں یعنی مسلم وہ شخص ہے جس نے احکام خداوندی کے سامنے اپنی گردن رضا کارانہ جھکا دی ہو۔ اس لیے ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوموں کے پیش نظر ''اقامت دین'' کے پروگرام کا پہلا جزو یا اصول یہ ہوا کہ ہر مسلمان سب سے پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرے۔ خوف و رجا کی ساری نیازمندیاں بس اسی ایک ذات کے لیے مخصوص کر دے۔ تعظیم و تذلل اور سرفگندی کے تمام جذبات اسی کی رضا جوئی کے لیے وقف کر دے۔ تمام اطاعتوں سے منہ موڑ کر بس اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔ اپنے نفس کو ان تمام امور سے پاک کرے جو اس کی ناخوشی کا سبب بنتے ہیں۔ اور ان تمام صفات سے اسے آراستہ کرے جو اس کی رضا کے باعث ہوتے ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری میں نہ تولیت و لعل کرے نہ دل تنگ ہو۔ اپنی نگاہ کو حق تعالیٰ کی رضا طلبی اور حکم برداری پر پوری طرح جمائے رہے۔ خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں، ناسازگاریاں اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں۔ کیونکہ یہ چیزیں اگرچہ بظاہر مشکلات و مصائب ہی ہیں مگر فی الواقع یہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی ضروری آزمائشی منزلیں ہیں جن سے گزرے بغیر کسی مدعیِ ایمان کا ایمان اور تقویٰ خدا کے ہاں سند اعتبار اور شرفِ قبول نہیں حاصل کرتا جیسا کہ قرآن کا فرمانا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ البقرہ 155:2

ہم تم کو (یعنی تمھارے ادعائے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور تمھارے مال اور جان اور پیداوار

کے نقصانوں کے ذریعے ضرور آزمائیں گے اور اے نبیؐ! ان لوگوں کو (کامرانی کا) مژدہ سنادو جو (ان خطرات ونقصانات کو) صبر وضبط کے ساتھ برداشت کرلیں۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ ۝ وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَلَيَعۡلَمَنَّ الۡكٰذِبِيۡنَ ۝

العنکبوت 29:3-2

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں پرکھا نہ جائے گا۔ حالانکہ (یہ پرکھنا ہماری ہمیشہ کی سنت ہے اور) ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے لہٰذا (تمھیں بھی) اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے (مومن) ہیں اور کون جھوٹے۔

اس لیے ان چیزوں سے گھبرانے اور کترانے کے بجائے ان کا صبر اور اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہوسکتا جو ان رکاوٹوں کے آگے سپر ڈال دے۔ اور نہ وہ سینہ تقوے کے نور سے بہرہ یاب ہوسکتا ہے جو اس آزمائش کی ہمت نہ رکھے۔ اپنے ایمان واسلام کے متعلق بڑے دھوکے میں ہوگا وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے نام نہاد جانی اور مالی، گروہی اور طبقاتی، قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے کر لینے کی فکر کرے، اور اتباع حق کو جان و مال کی کامل محفوظیت کے ساتھ مشروط رکھے۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام، اور اس کی شکل وصورت میں تقویٰ تو ہوسکتا ہے مگر اس کا باطن ان طائران قدس کا آشیانہ نہیں ہوسکتا۔ غرض اہل ایمان کی آزمائش اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے اور اسی سنت کو پورا کرنے کے لیے اس نے اسلام اور اتقاء کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے اور اس لیے جو شخص اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ آل عمران 102:3 کے فرمانِ الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

(۲) منظم اجتماعیت

اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا

آل عمران 3:103 کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ ان لفظوں میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے وہ دو باتوں پر مشتمل ہے، ایک تو یہ کہ وہ تمام اہل ایمان' جو احکام الٰہی وحدود خداوندی کی پابندی میں سرگرم عمل اور اپنی انفرادی اصلاح وتزکیے میں کوشاں ہوں، مل کر ایک مضبوط اور منظم جماعت بن جائیں اور یہ پوری جماعت ایک ہی جسم کے اعضاء کی طرح باہم جڑی ہوئی ہو۔ دوسری یہ کہ اسے اس طرح باہم جوڑ کر رکھنے والی چیز نہ تو کوئی نسلی رشتہ ہو نہ کوئی وطنی تعلق' نہ کوئی معاشی یا سیاسی مفاد ہو نہ کوئی دنیوی اور مادی مقصد بلکہ صرف ''اللہ کی رسی''، یعنی اس کی بندگی کا وہ عہد ہو جو ہر مسلمان نے کر رکھا ہے۔ وہ قرآن ہو جس کی پیروی ہی کسی شخص کو مومن بناتی ہے، وہ دین ہو جس کی اطاعت واقامت ہی کے لیے امت مسلمہ وجود میں لائی گئی ہے۔ غرض جس طرح ملت کا منظم اور متحد رہنا ایک ضرور چیز ہے اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس نظم واتحاد کا شیرازہ صرف یہ ''حبل اللہ'' ہی ہو۔ بلکہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات اس سے بھی کہیں زیادہ اہم نظر آئے گی۔ اتنی زیادہ اہم کہ مجبوری کی بعض ایسی حالتیں تو ہو سکتی ہیں جن میں اتحاد وتنظیم ملت سے محروم ہو کر بھی مومن خدا کے حضور معذور اور بری قرار دیا جائے گا۔ مگر جو چیز اس اتحاد وتنظیم کا شیرازہ ہے اسے کسی حالت میں بھی اگر چھوڑ دیا گیا تو اس کی باز پرس سے چھٹکارا ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اس لیے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب ومحبوب چیز ہے خواہ وہ کسی غرض کے لیے اور کسی مقصد پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کا مطلوب نہیں' بلکہ اس کی نظروں میں حد درجہ مردود اور مبغوض ہے اور اس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ صرف اس اتحاد کا ہے جس کا شیرازہ اتباع حق اور اقامت حق ہو۔

اقامت دین کا یہ نکتہ' یعنی جماعتی اتحاد' اگر ذرا غور کیجیے تو پہلے نکتے سے کوئی بالکل الگ اور بے تعلق چیز نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک طالب علم کو اس کی اپنی

طبیعت ہی مجبور کرتی ہے کہ اپنے ساتھی طلبہ سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔ ایک تعلیم یافتہ اور علم دوست کے مذاق اور مزاج ہی کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ارباب علم و دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف خود بخود کھنچ اٹھنے سے رک نہیں سکتا.......... اور اگر کسی طالب علم کو اپنے ساتھیوں سے، کسی صاحب علم کو اہل علم و فضل سے، کسی رنگین مزاج کو اہل نشاط سے گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب اور صاحب علم اور رنگین طبع نہیں۔ ہم مشربی کی یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبۂ جنسیت کہا جاتا ہے۔ اصولاً اس جاذبۂ جنسیت کو اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرنا چاہیے اور وہ کرتا بھی ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی کے جذبات سے سرشار ہو ان لوگوں کی طرف لازماً کھنچتا ہے جو اسی کی طرح اتباع حق اور تقویٰ کے لذت شناس ہوں۔ یہ ممکن نہیں کہ دو دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو اور اس کے باوجود وہ آپس میں کٹے ہوئے یا ایک دوسرے سے بے تعلق ہوں۔ اس کے بخلاف ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے کیونکہ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف اگر کہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ الحجرات 49:10 اور بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط الانفال 8:73 کے الفاظ سے کی گئی ہے تو کہیں رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ اور اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ المائدہ 5:54 ان کا نشان امتیاز ٹھیرایا گیا ہے۔ گویا اسلام کے پیروؤں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔ قرآن کی نگاہ میں اہلِ ایمان کے لیے اس وصف کا وجود کتنی اہمیت رکھتا ہے اس چیز کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بعض ان ہدایات پر بھی نظر ڈالی جائے جو اس معاملے کے منفی پہلو سے تعلق رکھتی ہیں ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ط وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ O التوبہ 9:23

اے ایمان لانے والو! اگر تمھارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو

اپنا ولی (قلبی رفیق) نہ بناؤ۔ اور جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی دوسرے مومنوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتا خواہ نسلی اور قومی لحاظ سے وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں اسی طرح وہ فساق و فجار سے قلبی رابطہ بھی نہیں رکھ سکتا۔ خواہ وہ اس کے قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جیسا کہ اس ضمن کی ایک اور آیت صراحت کرتی ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط المجادلہ 58:22

تم کسی ایسے گروہ کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو ان لوگوں سے الفت و مؤدت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی عداوت اور مخالفت پر کمر بستہ ہوں خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا اہل خاندان کیوں نہ ہوں۔

ان ارشادات سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ایمان کے رشتے کو انسانی تعلقات میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک طرف تو مختلف نسلوں اور قوموں کے افراد کو باہم بھائی بھائی بنا کر جوڑ دیتا ہے۔ دوسری طرف اس کی زبردست قوت تمام مادی رشتوں کو بے جان اور غیر موثر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ گویا یہ ایک سورج ہے جس کے آگے تمام ستارے بے نور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر ایمان کا یہ منفی اثر و عمل اس کے مثبت اثر و عمل کو مزید طاقت بھی دے دیتا ہے اور اہل ایمان کے مابین قائم ہونے والے اتحاد کو اور زیادہ مستحکم بنا دیتا ہے۔

غرض ایک نصب العین کی علم بردار اور ایک اصول کی پیرو دوسری جماعتیں جس حد تک اپنے ارکان کو ڈسپلن کی مضبوط بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہیں، اللہ کا دین اپنے پیروؤں کو اس سے بھی زیادہ مضبوطی سے جڑ جانے کی زبردست ہدایت کرتا ہے۔ انتشار و اختلاف کو وہ انتہائی مذموم ٹھیراتا ہے اور دینِ حق کے مزاج کے اسے یکسر خلاف قرار دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک پیغمبر (حضرت ہارون علیہ السلام) نے اپنی قوم کی اکثریت کو علانیہ بت پرستی

میں مبتلا ہو جاتے دیکھا مگر انھیں صرف سمجھانے بجھانے ہی پر اکتفا کیا اور ان کے خلاف کوئی فوری اقدام اٹھانے سے محض اس لیے احتراز کر گئے کہ کہیں قوم کی جمعیت پراگندہ نہ ہو جائے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سینا کی پہاڑی سے واپس آ کر ان سے اس سلسلے میں سختی سے باز پرس کی تو انھوں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ طٰہٰ 20:94 (میں اس بات سے ڈرا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی)

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اقامت دین کے پروگرام کی تیسری بنیاد وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ آل عمران 3:104 کے ارشاد میں واضح کی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے اپنی اپنی ذات کے اوپر دین حق کو قائم کر لینا اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بن جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان دونوں باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس ''خیر اور معروف'' کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول کیا گیا ہے اور اس ''منکر'' کو اپنے مقدور بھر مٹا ڈالنے کی مسلسل کوشش جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشے میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اقتدار باقی نہ رہ جائے۔

جس طرح اقامت دین کے عملی پروگرام کی دوسری دفعہ (افراد امت کا منظم) اتحاد پہلی دفعہ انفرادی صلاح وتقویٰ کا لازمی تقاضا ہے اس طرح یہ تیسری دفعہ (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) بھی اس کا فطری مقتضا ہے نہ کوئی ایسا مستقل بالذات حکم جو اس سے کسی طرح کی مزاجی مناسبت رکھتا ہی نہ ہو‌ یہ بات کہ امر بالمعروف کس طرح ایمان اور تقویٰ کی فطری طلب ہے، ایمان اور تقویٰ کی حقیقتوں پر غور کرنے سے با آسانی واضح ہو جاتی ہے۔ ایمان اور تقویٰ کی حقیقی روح کیا ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت بھری تعظیم۔ کوئی محبت بھری تعظیم محبوب کی مرضیات کے بارے میں کیا چاہے گی؟ صرف یہ کہ گرد و پیش انہی کی کارفرمائی

ہو۔ ورنہ اس دل کو سوز محبت سے آشنا کون کہہ سکتا ہے جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھ کر تڑپ نہ اٹھے؟ اس لیے خدا کی محبت اور حق کی جاذبیت ایک خدا پرست کو چین سے ہرگز بیٹھنے نہیں دے سکتی جب تک کہ صفحۂ ارض پر اس کی نگاہوں میں چبھنے کے لیے ایک باطل اور کھٹکنے کے لیے ایک منکر بھی موجود ہو۔ یہ بات اس کے اسلام اور ایمان کے یکسر منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین اللہ کے حلقۂ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرمانبردار دیکھے اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کر لے۔ لہٰذا اقامت دین کا فریضہ ادا نہیں ہوسکتا، اگر پیروان اسلام کی جمعیت امر بالمعروف سے غافل ہو اور اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ○ آل عمران 102:3 کا حکم تشنہ تعمیل ہی رہ جائے گا اگر اہل ایمان بس اپنی ذات ہی تک احکام الٰہی کی پیروی کو کافی سمجھ لیں اور ان کو اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اس کے علاوہ امر بالمعروف مومن اور مسلم اور متقی ہونے کے فطری تقاضوں میں ایک اور پہلو سے بھی داخل ہے اور وہ ہے اللہ کے بندوں سے اخوت، محبت اور خیر خواہی کا پہلو۔ جو شخص اسلام کو جانتا ہے وہ یہ بات بھی جانتا ہوگا کہ خدا سے محبت کرنے کا حق اس وقت تک ہرگز ادا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی مخلوق سے بھی محبت نہ رکھی جائے۔ اس مخلوق سے جسے اس کے رسول نے اس کی ''عیال'' کہا ہے (الخلق عیال اللہ) اور جس کی بہی خواہی کو ایمان کی نشانی ٹھیرایا ہے (لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ) (مسلم) نوع انسانی کے ساتھ بہی خواہی کی شکلیں بہت سی ہیں۔ مگر اس سے بڑی اس کی اور کوئی بہی خواہی نہیں کہ اسے ان راستوں سے بچایا جائے جو گمراہی اور ابدی ہلاکت کے راستے ہیں۔ اور جن پر چل کر انسان کی دنیا بھی عذاب بن جاتی ہے اور آخرت بھی۔ اس لیے ایک مومن اگر اپنے دوسرے ابنائے جنس کو ''منکرات'' سے روکنے اور خیر و معروف کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ دراصل کسی خارجی سبب کے تحت نہیں کرتا بلکہ اپنے اس جذبۂ خیر خواہی کے تحت کرتا ہے جو اس کے ایمان کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح اس کا ایمان اسے اس

بات پر ابھارتا رہتا ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلائے، ننگوں کو کپڑے پہنائے، اور کمزوروں اور بے کسوں کی مدد کرے، اسی طرح، مگر اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ وہ اسے اس بات کے لیے بھی بے چین رکھتا ہے کہ حق سے محروم بندگان خدا کو اس خزانہ سعادت کی کنجیاں مہیا کر دے جس کے پا لینے کے بعد پھر کبھی وہ نہ بھوکے ہوں گے نہ ننگے (اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ○ طٰہٰ 118:20) نہ انھیں اپنے مستقبل کا کوئی اندیشہ لاحق ہوگا نہ اپنے ماضی اور حال کا کوئی غم (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ البقرہ 277:2 اس کی ایمانی فکر و نظر اسے بتاتی رہتی ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اگر یہ بنیادی اور مقدم ترین خیر خواہی نہ کی گئی تو باقی ساری ہمدردیاں اور خیر خواہیاں بالکل ہیچ ہیں اور ان سے خدا کے بندوں کے حقوق ہرگز ادا نہ ہوں گے اور خدا کے بندوں کے حقوق کا ادا نہ ہونا خود اس کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہونے کی دلیل ہے۔

ایمان، اسلام اور تقویٰ سے امر بالمعروف کے یہ دو داخلی اور فطری تعلق تھے۔ ان کے علاوہ ان سے اس کا ایک خارجی اور مصلحتی تعلق بھی ہے جسے ہم دعوت اسلامی کا سیاسی مفاد کہہ سکتے ہیں۔ یعنی امر بالمعروف اسلام و ایمان کا فطری مطالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ایک سیاسی ضرورت بھی ہے اور وہ یہ کہ دعوت اسلامی کا علمبردار گروہ امر بالمعروف کا فریضہ بجالا کر ہی اپنے ایمانی جوہر کو پوری طرح برقرار رکھ سکتا ہے۔ اور اپنے مقصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس کے مختلف وجوہ ہیں:

(۱) اقامت دین کی عملی جدوجہد لازماً حق و باطل کی ایک طویل اور شدید جنگ کا دوسرا نام ہے۔ مقابلوں اور لڑائیوں کے متعلق فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو اقدام کی عملی جرأت رکھتا ہو، بقا اور ارتقا صرف پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست فوج بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے نہیں بچا سکتی اگر وہ دشمن سے مقابلے کے وقت اس پر آگے بڑھ کر حملے کرنا نہ جانتی ہو۔ اسی طرح کوئی تحریک بھی زوال و انحطاط کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکتی اگر وہ صرف اپنی داخلی تعمیر و تنظیم ہی میں

مصروف رہے اور اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی مہم سے غافل ہو۔ اس لیے وہ جماعت جو اللہ کا دین قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو اس وقت تک کامیابی کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ.......... طاغوتی مورچوں پر مسلسل حملے نہ کرتی رہے اور وہ اسلحہ جس سے یہ حملے کیے جا سکتے ہیں صرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اسلحہ ہے۔

(۲) جس طرح ایک جاندار کا جسم مختلف وجوہ سے کچھ نہ کچھ برابر تحلیل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنی اصل طاقت غریزی کو بحال رکھنے کے لیے غذاؤں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے تاکہ وہ اس کی رگوں میں تازہ خون پہنچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں۔ اسی طرح اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف گروہ کو بھی ایسے مختلف اسباب اور حالات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے جو اس کی توانائی کو متاثر کر دیا کرتے ہیں۔ اس لیے اسے بھی اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ایمان کو قوت بخش غذائیں دی جائیں' جو اس کے اندر خدا پرستی کی توانائیاں تازہ بتازہ داخل کرتی رہیں تاکہ وہ برابر چست رہے' فعال رہے اور ترقی کرتا رہے ورنہ رفتہ رفتہ اس کی قوت مرجھاتی چلی جائے گی۔ اور خود اس کے اپنے اوپر سے بھی دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا چلا جائے گا۔ ان ''قوت بخش غذاؤں'' میں سے جس سے یہ ایمانی توانائیاں حاصل ہوتی ہیں ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' بھی ایک بہترین ''غذا'' ہے۔

(۳) یہ کائنات اور اس کی ہر شے طبعاً متحرک پیدا کی گئی ہے، ٹھیراؤ سے اس کی فطرت نا آشنا ہے اس لیے وہ کسی ایک حالت پر رکی نہیں رہ سکتی بلکہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی سمت حرکت کرتی رہے۔ اسے اگر آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے تو لازماً پیچھے ہی ہٹنے لگے گی۔ یہی ''قانون حرکت'' قیام دین کے بارے میں بھی کام کرتا ہے۔ اس کو ایک مذکورہ اور فاتح تحریک کی شکل میں برابر آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ ورنہ جہاں اس میں رکاؤ پیدا ہوا اور اس کی اقدامی حرکت' جمود سے بدلی وہ پیچھے ہٹنا شروع کر دے گا۔ اس اقدامی حرکت کی ایک ہی عملی شکل ہے جس کا نام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

یہ ہیں وہ مختلف داخلی اور خارجی پہلو جن کی بنا پر امر بالمعروف' ایمان اور اسلام اور تقویٰ ہی کا ایک قدرتی مطالبہ ہے۔

نبوی ؐطریقِ کار کی شہادت

اقامت دین کا یہ طریقہ اور اس کے یہ اصول تو ہمیں قرآن سے ملتے ہیں۔ اب اگر آپ قرآن کے معلم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کیے ہوئے طریق کار پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ وہی اصول جو قرآن کے اندر الفاظ کے لباس میں تھے یہاں عمل اور واقعہ کی شکل میں موجود ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیک انھی لائنوں پر ایک امت بنا کر اللہ کے دین کو قائم کیا تھا۔

آپ ؐ نے عرب کے اندر، جس کا چپہ چپہ دین طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا، اپنی سعی و جہد کی ابتدا ایک کلمے سے کی۔ جس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام افکار و خیالات' جذبات و میلانات' اور اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات کو اس اللہ کے تابع فرمان بنا دے جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کا استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سنی گئی اور اس کو دبانے کے لیے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحب نظر ناواقف نہیں ہے۔ سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں' وطنی مفاد نے آڑے آنے کی کوشش کی۔ وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا۔ مصلحتوں نے دامن پکڑا' مشکلات نے راستہ روکا۔ ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا مگر اللہ کے اس بندےؐ نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی۔ اور حالات زمانہ' رفتار واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات' غرض ہر چیز سے آنکھیں بند کر کے برابر اسی حقیقت کو دوسروں پر کھولتا رہا' جو خود اس پر کھل چکی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقیدۂ توحید اور تصور زندگی میں بالکل اکیلا تھا لیکن اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ گوارا نہ کیا کہ اس عقیدے اور تصور کو چھپائے رکھے حالانکہ پوری دنیا اس کی زبان بندی پر کمر بستہ تھی۔ بالآخر اس دعوتِ حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور جن لوگوں کے اندر قبولِ حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں وہ ایک ایک دو دو کر کے آپ ؐ کے حلقۂ اطاعت میں آنے لگے۔ آپ ؐ نے ان کے اندر سب سے پہلے خدائے واحد کی غلامی اور پرستش کا گہرا

نقش بٹھایا اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھا دی کہ رضا صرف اسی کی چاہو۔ کیونکہ وہی ہے جس نے تمھیں زندگی بھی عطا کی ہے اور زندگی کو بسر کرنے کا سامان بھی دیا ہے اور حکم صرف اسی کا مانو' کیونکہ اس کے سوا سب تمھاری ہی طرح عاجز اور غلام ہیں۔ اسی طرح اپنی مسلسل تعلیم و تربیت سے آپؐ نے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا گرویدہ بنا دیا کہ دین توحید کے دشمنوں نے اپنے ترکش ظلم و انتقام کے سارے تیر خالی کر دیے مگر کسی بندۂ مومن کا دل توحید کی محبت سے خالی نہ کر سکے۔

اس تعلیم و تربیت اور تزکیے کے ساتھ ساتھ ان سب لوگوں کو جو حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے جا رہے تھے آپؐ ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جوڑتے گئے۔ یہ جڑنا اخلاقی طور سے اتنا پائیدار تھا کہ بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے ماند پڑ گئے اور آگے چل کر اجتماعی و سیاسی نقطہ نگاہ سے بھی اتنا منضبط نکلا کہ آج تک دنیا کی کوئی تنظیم اس کی یکتائی کو چیلنج نہ کر سکی۔ اس سلسلے میں آپؐ نے اہل ایمان کو جو غیر معمولی ہدایتیں دیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اور پھر جس طرح ان ہدایتوں پر انھوں نے عمل کیا وہ بھی دنیا پر روشن ہے۔ زندگی کے پیش آمدہ مسائل اور معاملات میں جس موقع پر بھی منظم اجتماعیت کا کوئی رنگ پیدا کرنے کی گنجائش نظر آئی' آپؐ نے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ خواہ معاملہ کتنی ہی معمولی قسم کا کیوں نہ ہوتا، حد یہ ہے کہ اگر تین آدمی ایک ساتھ کسی سفر پر بھی جاتے تو آپؐ کی ہدایت ہوتی کہ وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں اور اس کی سرکردگی میں سفر کریں۔ (اِذَا کَانَ ثَلَاثَۃٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْٓا اَحَدَھُمْ۔ مشکوٰۃ) مسلمانوں کے ذہن میں اس طرح اجتماعیت کی اہمیت پیوست کرتے اور انھیں ایک جسم کے اعضا کی طرح باہم جوڑتے ہوئے آپؐ نے اس امر کا بھی پورا اہتمام فرمایا کہ افتراق و انتشار کے عوامل اس اتحاد میں رخنے نہ پیدا کرنے پائیں۔ اس غرض سے آپؐ نے انھیں پوری طرح متنبہ کر دیا کہ امت کا یہ اتحاد و ائتلاف عام قسم کی صرف ایک ''سیاسی'' ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالص دینی ضرورت ہے اور اس کے بغیر وہ کام کسی طرح پورا ہی نہیں ہو سکتا جس کے لیے میری بحیثیت ایک نبی

کے اور تمھاری بحیثیت ایک امت کے بعثت ہوئی ہے۔ اللہ کی نصرت بھی تمھارے سروں پر اپنا سایہ اسی وقت ڈالے گی جب تم جماعت (ایک منظم پارٹی) کی شکل میں رہو (یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَةِ) اگر کوئی شخص اس جماعتی نظم سے بالشت بھر بھی الگ ہو گیا تو گویا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلادہ نکال پھینکا۔ (مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِیْدُ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ اِلَّآ اَنْ یُّرَاجِعَ۔ ترمذی) اور اس علیحدگی کی حالت میں اگر وہ مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ (مَنْ مَاتَ وَهُوَ مَفَارِقٌ لِلْجَمَاعَةِ مَاتَ مَیْتَةَ الْجَاهِلِیَّةِ۔ مسلم) ملت کے مقدس شیرازے پر جو شخص بھی افتراق کی قینچی چلانے کی کوشش کرے اس کی گردن مار دینا۔ (مَن اَرَادَ اَنْ یُّفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَهِیَ جَمِیْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّیْفِ کَائِناً مَّنْ کَانَ۔ مسلم)

ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان اللہ کے دین کو اس کے دوسرے بندوں تک پہنچانے میں برابر مصروف رہتے اور جس کسی کو جاہلیت کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اسے ان سے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار، ایک آقائے حقیقی کا غلام، اور ایک حاکم مطلق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے۔ جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کے درپے ہو جاتے۔ اور کفر وفساد کے جس طوفان سے رحمتِ حق نے انھیں نجات دی تھی اس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انھیں کسی حال میں بھی گوارا نہ ہوتا۔ یہ دعوتی جدوجہد مکہ میں تیرہ برس تک چل پائی تھی کہ دشمنان حق کے لیے اس کی کامیابی اور روز افزوں ترقی ناقابل برداشت ہو گئی اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کر کے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا۔ اس لیے آپؐ نے اور آپؐ کے سچے پیروؤں نے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہہ دیا اور مدینہ جا کر اسے اپنے مشن کا مرکز بنایا۔ جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور ادھر اہل ایمان کی ایک منظم جمعیت بھی فراہم ہو چکی تھی تو اب بدی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دینے اور نیکی اور انصاف کی بقا کے لیے آخری شکل اختیار کی گئی۔ یعنی منکر کو مٹا دینے کے لیے دل وزبان کی کوششوں کے علاوہ اب ہاتھ کی بھی کوششیں شروع

کر دی گئیں۔ ایک مدت تک تو طاغوتی طاقتیں خود بخود بڑھ بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور ہوتی رہیں اور آپؐ اور آپؐ کے ساتھی صرف مدافعت کرتے رہے۔ اس مدافعت میں انھوں نے جان و مال کی ہر ممکن قربانی دے کر حق کی شہادت ادا کی۔ یہاں تک کہ اس مدافعانہ پالیسی ہی کے دوران کفر کی شوکت ٹوٹنے لگی اور آخر کار عرب میں طاغوت کا علم سرنگوں ہوگیا۔ اسے دیکھ کر مسلمانوں کا دل اللہ کی تائید و نصرت پر شکر اور مسرت کے جذبات سے بھر گیا مگر اس کے باوجود اُن کے لیے اپنی کمریں کھول لینے کا ابھی کوئی موقع نہ تھا۔ اس لیے ان کی سواریوں کے کجاوے اسی طرح بندھے کے بندھے رہے کیونکہ اگرچہ عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیے تھے مگر اس کے باہر ہر طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی اور مسلمان اپنے اس فرض کو بھول نہیں سکتا تھا کہ منکر کو مٹا دینا چاہیے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ان تفصیلات سے یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید ہو یا سنتِ رسولؐ ہر ایک سے اقامت دین کے یہی تین بنیادی اصول معلوم اور متعین ہوتے ہیں۔ اس لیے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا' جب تک کہ ان تینوں اصولوں پر پورے عزم و استقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے لیکن اس سلسلے میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اس عمل درآمد میں کوئی ایسی زمانی ترتیب ہے جس کی رُو سے ضروری ہے کہ جب پہلے اصول پر پوری طرح عمل ہو لے تب دوسرے کی ابتدا کی جائے اور جب دوسرے اصول کی بھی پیروی کا حق ادا ہو جائے تب کہیں جا کر تیسرے کا نام لیا جائے۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ ان تینوں اصولوں پر عمل بیک وقت شروع ہو جانا چاہیے اور اگر اس عظیم مہم کے شروع کرنے سے پہلے کسی بات کی ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی سچی شہادت کے ساتھ انسان کا لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ پر ایمان ہو۔ اس یقین و اقرار کے بعد جب ایک شخص یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مخاطب کیے جانے والے گروہ میں داخل ہو گیا تو قرآن ایک ہی ساتھ اس کے سامنے اپنے یہ تینوں اصول رکھ دیتا ہے اور اس کے لیے

ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان پر عمل کرے۔

اس بات کی سب سے بڑی دلیل، کہ ان اصولوں پر عمل ایک ساتھ ہونا چاہیے یہ ہے کہ ان میں عملی پیروی کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں کیونکہ دوسرے اور تیسرے اصول اپنی حقیقت کے اعتبار سے اپنی ایسی کوئی مستقل بالذات نوعیت رکھتے ہی نہیں کہ ان کے وجود میں پہلے اصول کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی اصل کی شاخیں ہیں یا کم از کم یہ کہ اس کے راست تقاضوں میں شامل ہیں اور انھیں اختیار کیے بغیر خود اس پر عمل کا حق بھی ادا نہیں ہوسکتا۔ اس طرح دوسرے اور تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا دراصل پہلے ہی نکتے کے اتباع کو مکمل کرنا ہے۔

اس دعوے کی صحت معلوم کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کسی بحث کی ضرورت نہیں کہ تقویٰ کے صحیح اور کامل عملی مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے جسے اوپر کی سطروں میں ابھی جلد ہی واضح بھی کیا جاچکا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے سارے احکام کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا اور اس کی قائم کی ہوئی جملہ حدود کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ اس بات کو اگر ذہن میں پوری طرح مستحضر کرلیا جائے تو یہ حقیقت آپ سے آپ روشن دکھائی دینے لگے گی کہ اقامت دین کے آخری دو اصول فی الواقع پہلے ہی اصول کے اجزا یا اس کے قریب ترین تقاضے ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ اپنے نصب العین کی خاطر تمام اہل ایمان کا باہم متحد و منظم ہونا اور امر بالمعروف کو اپنی ایمانی زندگی کا شعار بنائے رکھنا بھی کتاب و سنت کی رو سے انھی احکام و حدود میں داخل ہے جن کی پیروی اور پابندی کا نام تقویٰ ہے۔

چنانچہ پہلے باہمی اتحاد کے بارے میں چند آیتوں کی شہادت سنیے:

(۱) یَآیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ التوبہ 119:9

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے مومنوں کے ساتھ رہو۔

(۲) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝
الحجرات 10:49

اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلاف و عناد پیدا ہو

جانے کی صورت میں) صلح کرادو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔

(۳) وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ الروم 30:32-31

اس کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر گروہ اپنے اپنے خیالات و افکار میں مگن ہے۔

ان آیتوں میں سے پہلی آیت کے اندر سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو، اور دوسری کے اندر دو باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جوڑ دینے کو ''اتقا'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور تیسری آیت میں ایک طرف تو ملی انتشار کو شرک کا خلاصہ قرار دیا گیا ہے، گویا یہ کہا گیا ہے کہ ملی اتحاد توحید کا خاصہ ہے۔ دوسری طرف اس میں توحید کے ماننے والوں سے تقویٰ اور اقامت نماز کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں سے ایک (یعنی تقویٰ) تو توحید کا باطن ہے اور دوسرا (یعنی نماز) اس کا ظاہر ہے۔ یہ سب باتیں اس امر پر صاف دلالت کرتی ہیں کہ ملی انتشار تقویٰ اور نماز دونوں کی روح کے یکسر منافی ہے۔ جماعتی اتحاد اور تنظیم تقویٰ کی ضروری اور اہم ترین علامتوں میں سے ایک علامت ہے اور اس کا موجود نہ ہونا صحیح تقویٰ کے نہ ہونے کا ثبوت ہے۔

اس کے بعد کچھ دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں سے اسی طرح امر بالمعروف کو بھی صلاح و تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے:

(۱) يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ ...... وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ آل عمران 3:115-114

یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں اور اچھے کاموں میں تیز گام رہتے ہیں.......... اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

(۲) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ التوبہ 9.123

اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قریب میں ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں۔ یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں مطلقاً ہر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو متقیوں کی صفات اور تقویٰ کے اعمال میں شمار کیا گیا ہے اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل، یعنی دین کے دشمنوں سے لڑنے کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

اب ایک اور آیت سنیے، جو ان دونوں حقیقتوں کی جامع ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ التوبہ 9:71

اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے ملی اتحاد اور امر بالمعروف دونوں چیزوں کو ایمان کے اعمال اور مقتضیات کی حیثیت سے ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے۔

ان تمام آیات کی روشنی میں اس وہم کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ جب تک اقامت دین کے پہلے نکتے پر پورا پورا عمل نہ ہولے اور انسان کا باطن نور تقویٰ سے اچھی طرح جگمگا نہ جائے اس وقت تک اس کے لیے دوسرے اور تیسرے نکتوں کی طرف توجہ کرنا صحیح نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال آج ایک واقعہ بن کر ہمارے بے شمار ذہنوں پر مسلط ہے اور اس نے دین کی خدمت و نصرت کے بارے میں ہمارے فکر و عمل کے زاویے بدل کر رکھ دیے ہیں۔ نصرتِ دین کی جو گاڑی تین پہیوں پر چلائی جانی چاہیے تھی اور جو ان تین پہیوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتی اسے صرف ایک پہیے سے چلانے کی عجیب و غریب کوشش ہو رہی ہے، جس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکل رہا ہے کہ یہ گاڑی ایک انچ بھی آگے بڑھنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑی کھڑی زمین میں کچھ اور دھنستی ہی جا رہی ہے۔ دراصل یہ خیال ایک زبردست حجاب ہے جو ہمارے اکثر نیکوکار افراد کی بصیرتوں پر خاص طور سے پڑا ہوا ہے۔ اس کا ظاہری پہلو یقیناً بڑا دیندارانہ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقتاً یہ نظریہ

اسلامی طرزِ فکر سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں رکھتا۔ جب ایک شخص سچا متقی بن ہی اس وقت سکتا ہے جب وہ اہل ایمان گروہ سے مربوط بھی رہے اور اپنی سکت بھر امر بالمعروف کا فرض بھی انجام دیتا رہے تو یہ کہنا کتنا بے معنی ہوگا کہ آدمی پہلے کامل اور معیاری متقی بن لے تب کہیں جا کر ملی اتحاد و تنظیم اور امر بالمعروف کی مہمات کا آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزا کی سی ہے، جس طرح بیج سے جوں ہی ننھا سا پودا اگتا ہے اس میں جڑ، تنے اور پتے سب کی تخلیق ہو جاتی ہے اور یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ نمو پاتی اور پروان چڑھتی رہتی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہو لیتی ہے تب اس میں سے تنا نکلتا ہے اور جب تنا اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہنچ جاتا ہے تب جا کر اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوتی ہیں............... اسی طرح قلب انسانی میں جب ایمان کا بیج جگہ پکڑتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس سے صرف تقویٰ کی جڑ ہی نکلتی ہو اور نکل کر ایک مدتِ دراز تک خوب موٹی تازی اور مضبوط ہوتی رہتی ہو، تب کہیں جا کر اتحاد ملی اور امر بالمعروف کا موقع آتا ہو۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ اس سے ملی اتحاد اور امر بالمعروف کی شاخیں اور پتیاں بھی نکلنے لگتی ہیں۔ پھر زمین کی زرخیزی اور بیج کی عمدگی کے مطابق تقویٰ کی جڑ جس قدر گہری اترتی جاتی ہے اسی قدر شاخیں اور پتیاں بھی بلند و بالا اور سرسبز و شاداب ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ ابراہیم 14:24 کا منظر سامنے آجاتا ہے۔

☆......☆......☆......☆......☆